غلامی سے آزاد ہو جائے تو وہ برادران وطن کے ساتھ سکون اور چین کی زندگی گزار سکیں گے اور ان کے لیے ترقی کی راہیں کھلیں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ خوابوں کے شیش محل ٹوٹ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ آزادی آئی اور بڑے طمطراق سے آئی، لیکن ان کے مسائل حل نہیں ہوئے۔ انگریزوں کے دور میں وہ جہاں تھے، وہیں رہے بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ اس سے بدتر مقام پر پہنچ گئے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں یہ ملک، بھارت اور پاکستان کے نام سے دو حصوں میں تقسیم ہو کر آزاد ہوا۔ اس تقسیم نے یہاں کی اکثریت اور مسلمانوں کے درمیان ایک زبردست خلیج پیدا کر دی۔ تقسیم کا مطالبہ مسلم لیگ نے کیا تھا اور کانگریس نے جو اکثریت کی نمایندگی کر رہی تھی بالآخر اس مطالبے کو تسلیم کر لیا اور تقسیم کے معاہدے پر دستخط کر کے اس کی منظوری دے دی۔ اس مشترکہ یا متفقہ فیصلے کے باوجود ایک طبقہ، جو کافی طاقتور تھا اور جس کے اثرات بڑے وسیع تھے، برصغیر کے تمام مسلمانوں کو تقسیم ملک کا ذمہ دار قرار دے رہا تھا۔ اس بحث کو فی الحال نظرانداز کر دیجیے کہ تقسیم کے ذمے دار صرف مسلمان تھے یا ان میں اکثریت کے رہنماؤں کا بھی کوئی قصور تھا۔ بہرحال اس طبقے کے نزدیک مسلمان مجرم تھے اور وہ ان کے اس جرم کو معاف کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو یہ شکایت تھی کہ اس طبقے کا رویہ ان کے ساتھ معاندانہ بلکہ جارحانہ ہے اور وہ ان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش تک نہیں کر رہا ہے۔

ان جذبات کے درمیان آزادی کا سورج آگ اور خون کے سمندر میں نہاتا ہوا طلوع ہوا، فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے ہر طرف بھڑک اٹھے، بستیاں ویران ہو گئیں، خاندان کے خاندان تباہ ہو گئے۔ کم از کم پورا شمالی ہند خون سے لالہ زار ہو گیا۔

خیال تھا کہ ملک کی تقسیم سے جو زخم لگے ہیں، وہ وقت گزرنے کے ساتھ مندمل ہو جائیں گے لیکن آزادی کے پچاس برس گزرنے کے بعد بھی فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ جس شدت کے ساتھ جاری ہے اور ان فسادات میں جس بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی جان، مال اور عزت و آبرو کا نقصان ہوا ہے، اس سے اس خیال کی مسلسل تردید ہو رہی ہے۔ ان حالات میں فطری طور پر مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے اور وہ ایک غیر یقینی کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب یہاں ان کی کوئی بھی چیز کسی بھی وقت فسادات کی نذر ہو سکتی ہے۔

دستور ہند کی رو سے مسلمان برابر کے شہری ہیں، لیکن ابھی تک اکثریت کے ایک خاص طبقے کا ذہن یہ ہے کہ جب ملک تقسیم ہو گیا اور مسلمانوں کو پاکستان کی شکل میں ایک الگ خطہ زمین مل گیا تو ہندستان میں مسلمانوں کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔ اس وجہ سے وہ ان کے ساتھ مساوی سلوک کے لیے تیار نہیں ہے۔

تقسیم ہند کی وجہ سے، جس کی ذمے داری صرف مسلمانوں پر نہیں ڈالی جا سکتی، اس کے کچھ اور

اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔ اس ملک کا ایک خاص طبقہ مسلمانوں سے مستقل طور پر بدگمان ہے۔ بدگمانی کی عینک سے جب وہ دیکھتا ہے تو اسے مسلمانوں کا پورا کردار مشکوک نظر آتا ہے۔ اور ان کے بے ضرر عمل سے بھی وہ خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اس بدگمانی کی وجہ سے ان کی قربانیاں اور خدمات شک و شبہ کی نذر ہو جاتی ہیں۔ بدگمانی کی اس فضا میں ذرا سی بے احتیاطی سے دونوں قوموں کے درمیان کوئی بھی افسوس ناک واقعہ پیش آ سکتا ہے اور اس کے نتائج سنگین برآمد ہو سکتے ہیں۔

۱۹۴۷ کے بعد ملک کے اندر جارحیت کا رجحان بڑی شدت سے ابھرا ہے۔ بدقسمتی سے اس ملک کی اکثریت میں یہ رجحان قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس رجحان کو کنٹرول کیا جائے اور اس کی اصلاح کی تدابیر کی جائیں' اقلیت کو متعصب' تنگ نظر' جارح اور ظالم قرار دیا جاتا ہے تاکہ اپنی جارحیت کے لیے وجہ جواز فراہم کی جا سکے اور یہ ثابت کیا جا سکے کہ اکثریت کے اندر جارحیت ہے تو ردعمل ہے اقلیت کی جارحیت کا۔ اس کے لیے مسلمانان ہند کی پوری تاریخ کو بڑی بھیانک شکل دی جا رہی ہے اور اسے ہندو مسلم کش مکش کی تاریخ بلکہ مسلمانوں کے ظلم و بربریت اور برادران وطن کی مظلومی اور محکومی کی تاریخ میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔

یہ دعویٰ نہیں ہے کہ مسلمانوں کا دامن ہر عیب سے پاک ہے' ان سے غلطیاں نہیں ہوئیں یا نہیں ہوتیں' وہ جذبات میں مشتعل نہیں ہوتے یا ان سے جارحیت کا کبھی ارتکاب نہیں ہوتا۔ لیکن کسی فرد یا کچھ افراد کی غلطی کی وجہ سے پوری قوم کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دینا اور ان کے ساتھ مجرموں کا سلوک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ جس قوم کے ہاتھ میں اقتدار ہو اسے بڑا فراخ دل اور وسیع الظرف ہونا چاہیے۔ جو قوم دوسروں کا احتساب کرنے اٹھے' اسے پہلے اپنا احتساب کرنا چاہیے۔

جارحیت کے اس رجحان سے مسلمانوں کو سخت نقصانات پہنچ رہے ہیں' ان میں سے چند ایک کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے:

۱۔ مسلمانوں نے اس ملک میں اپنی دینی' سیاسی' سماجی اور معاشی ضروریات کے تحت بہت سے ادارے قائم کیے ہیں۔ ان اداروں کو انھوں نے اپنے خون جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا ہے۔ ان کے تہذیبی مراکز بھی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہاں سے انھیں دین و ایمان کی دولت بھی ملے اور ان کی مادی ضروریات بھی پوری ہوں۔ لیکن ان کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے' ان کی امتیازی خصوصیات کو پسند نہیں کیا جاتا۔ ان میں حکومت کا عمل دخل اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اقلیتی اداروں کی حیثیت سے انھیں چلانا مشکل ہے۔

۲۔ اردو' ہندستان کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کی مادری زبان ہے۔ یہ ان کا فطری اور دستوری حق ہے کہ اسے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کیے جائیں اور اردو بولنے والوں کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک

نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے لیے اس زبان کی اہمیت دینی لحاظ سے بھی ہے۔ یہ اپنے دامن میں دینی علوم کا بڑا مستند ذخیرہ رکھتی ہے۔ اس کے ذریعے وہ اپنے دین سے باآسانی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اردو کے مراکز میں بھی اس کے ساتھ جو بے اتفاقی بلکہ ناانصافی ہو رہی ہے اور ہندی کے فروغ کے نام پر اسے ختم کرنے کی جس طرح کوشش کی جا رہی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ تنگ نظری اور جارحیت کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی مسائل ہیں جن میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے، جیسے تعلیم کا مسئلہ، معاش کا مسئلہ، ملازمتوں میں تناسب کا مسئلہ وغیرہ۔

بعض مسائل کا مسلمانوں کے دین سے براہ راست تعلق ہے۔ ان مسائل کی وجہ سے وہ یہ سوچنے میں حق بہ جانب ہیں کہ ایک خاص دائرے میں انھیں اپنے دین پر عمل کی ازروے دستور جو آزادی حاصل ہے، اس پر بھی شب خوں جاری ہے اور وہ ہر وقت خطرے میں ہے۔

۱۔ کتنی ہی مساجد سے مسلمانوں کا عمل دخل ختم ہو چکا ہے اور کتنی ہی مساجد آثار قدیمہ میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ اسی جارحیت کا بدترین مظاہرہ بابری مسجد کے سلسلے میں سامنے آیا۔

۲۔ مسلمانوں کا پرسنل لا ان کے دین کا ایک حصہ ہے۔ یہ انگریزوں کے دور حکومت میں بھی محفوظ رہا لیکن اب یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں بہت سی باتیں قابل اصلاح ہیں، ان کی اصلاح ضرور ہونی چاہیے ورنہ ملک ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ پورے ملک کے لیے یکساں سول کوڈ پر اصرار کیا جاتا ہے اور دستور ہند کے رہنما اصولوں میں اس کی سفارش بھی کی گئی ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانان ہند کے لیے سب سے زیادہ تشویش کا باعث ہے۔ جو لوگ مسلم پرسنل لا میں ترمیم چاہتے ہیں وہ دراصل اسلامی شریعت میں ترمیم چاہتے ہیں۔ اس ترمیم کا حق مسلمانوں کے نقطہ نظر سے نہ کسی فرد کو حاصل ہے اور نہ کسی ریاست کو۔ دوسری بات یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ اس ملک میں جب بھی بنے گا وہ اکثریت کی روایات اور اس کے رجحان کے تابع ہو گا۔ ایک کمزور قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ یکساں سول کوڈ کا مطلب ہے مسلمان اقلیت کا اکثریت کے تابع ہو جانا۔

۳۔ اس بات کی بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے بنیادی سرچشموں سے بدگمان کر دیا جائے اور یہ بات ذہنوں میں بٹھا دی جائے کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات اس دور میں اور ملک کے موجودہ حالات میں ناقابل عمل ہیں۔ اب تو یہ بات باور کرائی جا رہی ہے کہ قرآن و حدیث میں ایسا مواد پایا جاتا ہے جو ملک کے اتحاد کی راہ میں رکاوٹ ہے اور مسلمانوں کو دوسری قوموں سے برسرپیکار رکھتا ہے۔ اس مواد کو حذف ہونا چاہیے یا اس میں مناسب ترمیم ہونی چاہیے۔ ان خرافات کی تائید بعض اوقات وہ لوگ بھی کرتے ہیں جن کے نام بدقسمتی سے مسلمانوں جیسے ہیں۔ اس تائید کا انھیں صلہ بھی مل جاتا ہے حالانکہ ان

میں سے کسی کا مسلمانوں کے اندر کوئی وقار نہیں ہے۔

اس طرح کے اقدامات سے مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ ان کا دین، ان کے مقدس مقامات اور ان کی مقدس کتابیں سب جارحیت کی زد میں ہیں۔ کسی بھی وقت ان کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہاں اکثریت کے خاص ذہن کا ذکر ہے جو موثر اور طاقتور ہے، جس کے اثرات سے اکثریت پوری طرح آزاد نہیں ہے، ورنہ اکثریت میں ایسے افراد بھی ہیں جنھیں کمزوروں کے ساتھ ہمدردی ہے اور جو نہیں چاہتے کہ کسی طبقے کو ظلم و ستم کا ہدف بنایا جائے اور اس کی ترقی کی راہیں روک دی جائیں۔ لیکن یہ طبقہ موثر نہیں ہے یا اس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ ظلم کے خلاف برملا آواز اٹھائے اور کھل کر مظلوم کا ساتھ دے۔ ملک کی خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ یہ طبقہ مضبوط ہو۔ جب تک یہ مضبوط نہ ہو، صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آ سکتی۔

ان مسائل کو حل کرنے کے لیے مسلمانوں کی طرف سے عملاً جو کوششیں ہو رہی ہیں یا جو کوششیں وہ کرنا چاہتے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ خود مسلمان اپنے ان مسائل سے کماحقہ واقف نہیں ہیں بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ وہ ان سے بے خبر ہیں۔ جو قوم اپنے مسائل ہی سے بے خبر ہو، وہ انھیں حل کیا کرے گی؟ لہٰذا انھیں ان مسائل سے باخبر کرنا اور ان کے اندر یہ احساس پیدا کرنا ضروری ہے کہ وہ غفلت کی نیند سے جلد بیدار ہوں ورنہ ان کی متاع حیات لٹ جائے گی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔

۲۔ ملک کی اکثریت کو مسلمانوں کے مسائل سے آگاہ کیا جائے اور بہ حسن و خوبی انھیں سمجھایا جائے کہ وہ کن مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان کی مشکلات حقیقی ہیں، فرضی نہیں ہیں۔ ان کی باتوں کو ایک حریف قوم کا شور و غوغا سمجھ کر وہ کان بند نہ کر لیں بلکہ آنکھیں کھول کر ان کے حالات کا جائزہ لیں اور ٹھنڈے دل سے ان کی مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ کسی جمہوری ملک میں اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ اپنے حقوق کے لیے دستوری جدوجہد کی جائے۔ دستور ہند نے اقلیتوں کو جو ضمانتیں دی ہیں وہ مسلسل پامال ہو رہی ہیں۔ ان ضمانتوں کو بحال کرایا جائے اور حکومت اور انتظامیہ کو ان کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے۔

۴۔ انتخابی سیاست کے ذریعے دباؤ ڈالا جائے۔ جمہوریت میں ووٹ کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی ایک طاقت ہوتی ہے۔ اب تک مسلمانوں کی اس طاقت سے اغیار فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور انھوں نے آنکھیں بند کر کے ان کے حق میں ووٹ دیا ہے لیکن اب اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے اس طاقت کو استعمال کریں۔ صرف انھی امیدواروں اور پارٹیوں کو ووٹ دیں جو ان کے حقوق کی حفاظت کی ذمے داری لیں۔

۵۔ اپنے حقوق کے لیے جمہوری طریقوں سے حکومت پر دباؤ ڈالا جائے۔ اس میں جلسے، جلوس، مظاہرے، احتجاج وغیرہ تمام معروف ذرائع آسکتے ہیں۔

یہ تمام کوششیں کسی نہ کسی درجے میں کی جا رہی ہیں بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ مسلمانوں کی سیاست ان ہی کے گرد گھومتی ہے۔ یہ کوششیں منظم طریقے سے ہوں تو ان کے کچھ نہ کچھ نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں یہاں بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔

یہ ساری کوششیں امت کے بقا اور تحفظ کی ہیں۔ یہ اس لیے ہیں تاکہ اس ملک میں مسلمانوں کا وجود باقی رہے، ان کا اثاثہ محفوظ رہے، ان پر کسی طرف سے کوئی صدمہ نہ ہو۔ وہ معاشی، تعلیمی اور سیاسی لحاظ سے کسی گراوٹ اور پستی میں مبتلا نہ ہوں بلکہ ترقی کریں اور آگے بڑھیں۔ یہ ایک بہت ہی پاکیزہ مقصد ہے۔ اس کی اہمیت سے کوئی بھی ایسا فرد جسے ملت سے تھوڑی سی بھی ہمدردی ہو، انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں، وہ بظاہر حالات ایک طویل جدوجہد کی طالب ہیں۔ ہم نے پچاس برس کے عرصے میں بہت تھوڑا سا راستہ طے کیا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ منزل بہت دور ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی وقت یہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے تو سوال یہ ہے کہ کیا کچھ اور مسائل اسی نوعیت کے یا ان سے سخت نوعیت کے پیدا نہیں ہو سکتے؟ کیا ہمارا کام صرف ان مسائل کو حل کرنا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا کام امت کے سامنے نہیں ہے؟

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ جس امت کے بقا و تحفظ کی کوشش ہو رہی ہے، اس کا ایک مقصد حیات ہے۔ اسی نے اسے ایک امت بنایا ہے اور اسی میں اس کی بقا کا سامان بھی ہے۔ قوموں کو نہ تو مسائل زندہ رکھتے ہیں اور نہ وسائل۔ ان کی زندگی ان کے اعلیٰ مقاصد سے وابستہ ہوتی ہے۔ جو قوم اپنے مقصد حیات کو فراموش کر بیٹھے، اس کی بقا کی ساری جدوجہد ناکام ہو جاتی ہے۔ اس لیے اصل توجہ اس پر ہونی چاہیے کہ امت اپنے مقصد حیات کو نہ بھولے بلکہ اس کی طرف پیش قدمی کی جدوجہد کرتی رہے۔ اس جدوجہد میں اس کا مرمٹنا ہی اس کی کامیابی ہے۔

کہا جا سکتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس وقت اصل مسئلہ امت کے بقا و تحفظ کا ہے۔ دوسرے مسائل اس کے بعد کے ہیں۔ جس شخص کی جان پر بن آئے اور جو شدید کش مکش حیات سے دوچار ہو یا فقر و فاقہ نے جس کی کمر توڑ رکھی ہو، اس کے سامنے مقصد حیات کی بحث کرنا فضول ہے۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اس غور و فکر کے لیے تیار ہی نہیں ہو گا۔

ہماری درخواست صرف یہ ہے کہ ان کے خیر خواہ اور مخلص اس کی جان بچانے کی ضرور فکر کریں اور اس کی غربت و افلاس کا علاج بھی ڈھونڈیں لیکن ساتھ ہی اس کے دین و اخلاق کی طرف بھی توجہ دیں ورنہ اس کا امکان ہے کہ صحت یاب ہونے کے بعد وہ اس زوال یافتہ معاشرے کا ایک عام فرد ثابت ہو اور

وسائل حیات فراہم ہو جانے پر تو اس کا بھی خطرہ ہے کہ وہ دوسروں سے بدتر نکلے۔ امت کا ہر فرد اس کا بڑی قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کے لیے اس کی اس طرح تربیت ہونی چاہیے کہ امت کے مقاصد کو وہ ہمیشہ پیش نظر رکھے اور کسی قیمت پر اس کے مفاد کو نقصان نہ پہنچنے دے۔

اس معاشرے میں فرد اور قوم کے درمیان فرق کرنا بھی ضروری ہے۔ مسائل و مشکلات، ہو سکتا ہے کسی فرد کو کچل کر رکھ دیں لیکن بامقصد قوموں کو حیات تازہ عطا کرتی ہیں۔ حالات کی ہر چوٹ ان کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور وہ زیادہ قوت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کرتی ہیں۔ اقبال تو ہر فرد سے کہتے ہیں: "اگر خواہی حیات اندر خطر زی"۔ یہ اصول فرد سے زیادہ قوموں پر منطبق ہوتا ہے۔ بامقصد قوم کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی بلکہ رکاوٹ جتنی بڑی ہوتی ہے اتنی ہی اس کی دفاعی قوت بڑھ جاتی ہے اور وہ آگے بڑھنے کی راہیں خود بخود نکالتی چلی جاتی ہے۔ جو قوم مسائل و مشکلات میں الجھ کر اپنے مقصد حیات ہی کو بھول جائے وہ تادیر باقی نہیں رہ سکتی۔

اس امت کا مقصد حیات کیا ہے؟ اس کا جواب خدا اور رسولؐ نے بہت واضح الفاظ میں دیا ہے۔ اسے دو دفعات میں بیان کیا جا سکتا ہے: ایک "اسلام کی طرف بازگشت" اور دوسرے "اسلام کی دعوت"۔

اسلام کی طرف بازگشت یہ ہے کہ اسلام کی طرف، جس سے ہم بہت دور ہو چکے ہیں، پھر سے ہم پلٹ آئیں اور اس طرح پلٹ آئیں کہ اپنی پچھلی بے راہ روی کی تلافی ہو جائے۔ اس طرح اسے سینے سے لگائیں اور اس طرح چمٹیں جیسے عزیز ترین متاع گم شدہ اچانک ہاتھ آ گئی ہو۔ اپنی شخصیت کو بے چون و چرا اور بالکلیہ اس کے حوالے کر دیں تاکہ اس پر اس کا اور صرف اسی کا حکم چلے۔ اپنے معاملات کی زمام اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ اس کے ذرا سے اشارے پر دوڑ پڑیں اور جس طرف بڑھنے سے وہ منع کرے اس طرف اٹھے ہوئے قدم بھی رک جائیں۔ ہماری پوری زندگی پر اسی کی فرماں روائی ہو اور زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو اس سے آزاد نہ رہنے پائے۔ اس کی حکومت ہماری شخصیت پر ہو، ہمارے فکر و عمل پر ہو، ہمارے بیوی بچوں اور خاندان پر ہو، ہمارے لین دین اور کاروبار پر ہو، ہمارے اداروں اور ہماری تنظیموں پر ہو۔ غرض یہ کہ جہاں تک ہمارا بس چلے ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلام ہی اسلام نظر آئے اور جن دائروں میں ہم اسلام قائم کر سکتے ہیں، ان میں عملاً قائم ہو جائے۔ اس راہ میں جان، مال، جذبات، تعلقات، جاہ و منصب، رسوم و رواج، ہر چیز کا نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

یہ بازگشت، اسلام کو ماننے کا فطری تقاضا ہے۔ اس کے بغیر اسلام کا دعویٰ کھوکھلا دعویٰ ہو گا۔ اس کے بغیر ثمرات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ پھر اسی بازگشت کے ذریعے امت کو ایک نقطے پر جمع کیا جا سکتا ہے۔ امت کے اندر اسلام کا شعور جتنا زیادہ ہو گا اور ان کی زندگیوں میں وہ جس قدر نمایاں ہو گا، اس کی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو گا اور افتراق و انتشار کی ماری ہوئی یہ امت ایک نقطے پر جمع ہو سکے گی۔ یہی اتحاد اس

کے موجودہ مسائل کے حل کا قوی ترین اور موثر ترین ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ ان مسائل کے حل کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ امت صرف اسلام ہی کی بنیاد پر متحد اور متفق ہو سکتی ہے۔ کسی اور بنیاد پر متحد ہونا اس کے مزاج اور فطرت کے خلاف ہے۔ اس طرح کا اتحاد وقتی طور پر پیدا ہو بھی جائے تو وہ دیرپا نہیں ثابت ہوتا اور بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔

یہ اسلام جسے ہماری زندگی میں پوری طرح اتر جانا چاہیے اور جس کا ہمیں عملی نمونہ بن جانا چاہیے' اسی کی ہمیں دوسروں کو دعوت دینی ہے۔ اس کا مطلب وعظ و تبلیغ اور فضائل و مناقب کا بیان نہیں ہے بلکہ اسلام کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ وہ جدید ہندستان کے سوالوں کا جواب بن جائے۔ آج یہ ملک گوناگوں مسائل اور مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ آپ کو یہ ثابت کرنا ہو گا کہ اسلام ان مسائل و مشکلات سے اسے نکال سکتا ہے۔ انسان کی زندگی اس کے عقائد کے تابع ہوتی ہے۔ اس ملک کی اکثریت الحاد و دہریت' شرک اور اصنام پرستی اور متعدد خرافات کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام توحید خالص کا صاف ستھرا عقیدہ پیش کرتا ہے۔ یہ عقیدہ ایک طرف تو عقل و منطق کی میزان پر پورا اترتا ہے اور انسان کے دل و دماغ کو مطمئن کرتا ہے اور دوسری طرف خدا سے اس کائنات اور انسان کے رشتے کو واضح کرتا ہے۔ اس رشتے کو کھولنے سے جدید اور قدیم فلسفے عاجز ہیں۔ آپ عقیدۂ توحید کو ہندستان میں اس طرح پیش کریں کہ وہ اس کے عقائد و افکار کا بدل بن جائے۔

یہ ملک سیاسی' سماجی' تہذیبی اور لسانی لحاظ سے افتراق کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقے سے شاکی اور ایک حصہ دوسرے حصے سے برسرپیکار ہے۔ دل پھٹ چکے ہیں' منافرت اور تعصب کی آگ ہر طرف بھڑک رہی ہے۔ ان حالات میں بظاہر اس ملک کو متحد اور ایک وحدت بنائے رکھنے والی کوئی طاقت نہیں ہے۔ البتہ اسلام اس ملک کو جوڑنے والی طاقت بن سکتا ہے۔ وہ یہ تصور دیتا ہے کہ سارے انسان رنگ' نسل اور زبان کے اختلاف کے باوجود ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کی اولاد ہیں۔ سب کی نجات اسی ایک خدا کی عبادت اور بندگی میں ہے۔ آپ کو ثابت کرنا ہو گا کہ اسی تصور کے ذریعے ملک کو اختلاف اور انتشار سے بچایا جا سکتا ہے اور اس کے اتحاد کو باقی رکھنا ممکن ہے۔

ہندستان نے سیاست میں مغرب کے جمہوری نظام کو اختیار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور کے انسان کی رسائی یہیں تک ہی ہو سکی ہے۔ اس سے آگے وہ سوچ نہیں سکا ہے لیکن انسانی فکر کبھی لغزشوں سے پاک نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس کا جمہوری نظام خوبیوں کے ساتھ اپنے اندر بہت سی خامیاں بھی رکھتا ہے۔ ان خامیوں کا اعتراف خود مغربی مفکرین کو ہے لیکن اس کا کوئی بدل ان کے پاس نہیں ہے۔ ان ہی خامیوں کی وجہ سے علامہ اقبال نے کہا:

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

"طرز جمہوری سے پرہیز کرو۔ کسی مرد پختہ کار کا دامن پکڑ کیوں کہ دو سو گدھے مل کر بھی ایک انسان کی طرح نہیں سوچ سکتے"۔

اسلام جمہوریت کو اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کا پابند بناتا ہے اور فرد اور ریاست دونوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ٹھہراتا ہے۔ یہ تصور ان خرابیوں سے پاک ہے جو موجودہ جمہوریت میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کا فرض اور ملک کی بہی خواہی کا تقاضا ہے کہ آپ ہر سطح اور ہر موڑ پر اس کی بھرپور وکالت کریں اور اس کی حقانیت کا ثبوت فراہم کریں۔

ہندستان نے معاشی میدان میں سوشلزم کی راہ اختیار کی ہے۔ اس کے ساتھ وہ سرمایہ دار نظام سے اپنا رشتہ توڑنا بھی نہیں چاہتا۔ اس بحث سے قطع نظر اپنی ساری کوششوں کے باوجود یہ نظریات اس کے معاشی مسائل حل نہیں کر سکتے ہیں' آپ کو بتانا ہو گا کہ سوشلزم اور سرمایہ داری کے مقابلے میں اسلام معیشت کی بہترین بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ اس کو اختیار کر کے انسان اس راہ کی ناہمواریوں سے بچ سکتا ہے۔ اسی طرح موجودہ قانون کے مقابلے میں اسلامی قانون کی اور موجودہ ضابطہ اخلاق کے مقابلے میں اسلام کے ضابطہ اخلاق کی' غرض زندگی کے ہر گوشے میں اسلام کی برتری ثابت کرنا آپ کا فرض ہے۔

اس طرح آپ اسلام کو ایک متبادل نظام کی حیثیت میں اہل وطن کے سامنے پیش کر سکیں گے اور یہ ثابت کر سکیں گے کہ آپ کے پاس وہ دولت ہے جو کسی طبقے یا کسی جماعت کے پاس نہیں ہے۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ ہندستان یہ سوچنے پر مجبور ہو گا کہ آپ کا مقام' قیادت اور رہنمائی کا ہے۔ آپ اس سے اپنے حقوق کے طالب ہی نہیں ہیں بلکہ زندگی کے ہر میدان میں اسے کچھ دینے کی بھی پوزیشن میں ہیں۔ اس سے آپ کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو گی۔ عظمت اور برتری آپ کے ساتھ چلے گی۔ آپ برابر کی سطح سے بلکہ اونچی سطح سے بات کر سکیں گے۔ یہ ملک آپ کو قائد اور رہنما کی حیثیت سے دیکھے گا اور آپ' اللہ نے چاہا تو اس کے محسن اور نجات دہندہ ثابت ہوں گے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اس طرح کی جدوجہد شروع ہوتے ہی اس ملک میں امت کے موجودہ مسائل ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت بھی مسائل ہوں گے' موجودہ مسائل سے زیادہ ہوں گے اور شدید تر ہوں گے' آپ کی دعوت کو چیلنج کیا جائے گا' اعتراضات کی بوچھاڑ ہو گی' آپ کی چھوٹی بڑی ایک ایک کوتاہی زیر بحث آئے گی اور رکاوٹ بنے گی' آپ پر مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کا الزام عائد ہو گا۔ آپ پر سختیاں ہوں گی حتیٰ کہ دار و رسن ہو گا۔ لیکن اسی میں اسلام کے ساتھ آپ کے تعلق اور خلوص کا امتحان بھی ہو گا اور اسی سے امید ہے بدگمانیاں دور ہوں گی اور اسلام کے فروغ کی راہیں کھلیں گی۔ دعا ہے کہ ہم اس امتحان میں کامیاب ہوں۔

Snowhite

DRY CLEANING INDUSTRIES

Karachi – Multan – Lahore – Rawalpindi

Steps ahead in drycleaning ___ always

ہیڈ آفس:	عبداللہ ہارون روڈ	5681724, 5685124-3
شاخیں:		
کراچی:	سنو وہائٹ چیمبرز سینٹرل کمرشل ایریا' بہادر آباد	4933690
	عثمان منزل' محمد بن قاسم روڈ (برنس روڈ)	213336
	کلفٹن عقب میکسزم	573298
	ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی برانچ	5845142
	گرومندر' نیو ٹاؤن	4910521
	گارڈن روڈ نزد بمبینو سینما	7730301
	پاریا اسٹریٹ کھارادر	204175
	سنو وہائٹ کمپلیکس شارع فیصل / شہید ملت روڈ	4541258
	کارپٹ کلیننگ ڈویژن	5685124
	24 کمرشل اسٹریٹ فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی	543451
	گلشن اقبال	471676
ملتان:	خان پلازہ' کینٹ	40538
لاہور:	لبرٹی مارکیٹ' بالمقابل لبرٹی پلازہ	874933
	ڈیفنس' مسجد چوک	
	کارپٹ کلیننگ ڈویژن	871366
راولپنڈی:	مال روڈ' الامین پلازہ' بالمقابل کنٹونمنٹ بورڈ آفس ایئرپورٹ روڈ	567988

Snowhite

DRY CLEANING INDUSTRIES

Karachi – Multan – Lahore – Rawalpindi